اب جوں جوں عرب کے مختلف قبائل بخوشی اسلام قبول کرتے چلے گئے اور اپنی زندگی کے رشتے مدینہ کے مرکز سے جوڑتے گئے، مملکتِ اسلامیہ کے حدود وسعت پذیر ہوتے گئے حتیٰ کہ پورا عرب اس قلمرو کے دائرۂ عمل میں آگیا۔ ایسا کرنا ملکِ عرب میں بسنے والوں کا فطری اور جائز حق تھا۔ ایک قوم کا ملک کو جو مختلف حلقوں اور حصوں میں بٹا ہو متحد کرکے باہم مربوط ہو جانے اور ایک مملکت کی صورت اختیار کر لینے کا حق ہمیشہ سے حاصل رہا ہے۔ جرمن قوم کی تعمیر اسی طرح ہوئی۔ یونان اور روما کی عظیم الشان سلطنتیں اسی اصول پر تشکیل ہوئیں۔ خود برطانیہ اور امریکہ اپنی تاریخ کے اوائل میں منتشر تھے لیکن جب ان میں اجتماعی شعور پیدا ہوا تو تھوڑی بہت خونریزی اور خانہ جنگی کے بعد دو زبردست وحدتیں وجود میں آئیں۔ یہی راہ عرب کے مختلف قبائل نے اختیار کی اور وہ ایک زبردست مملکت بن گئے۔

اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا

پہلے پہل یہ مملکت ایک چھوٹی سی بستی (مدینہ) تھی اور اپنے اردگرد کے قبائل اور مکہ کے کفار سے اسے خطرہ تھا۔ مگر جب مکہ اور مدینہ، طائف اور خیبر سب ایک ہو گئے تو عرب کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی دو عظیم شہنشاہتیں ان کو اچانک ابھرتا ہوا دیکھ کر ان کی دشمن ہو گئیں اور ان کی تباہی کے منصوبے باندھنے لگیں۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ سے جو ٹکر لی اور جہاد کیا وہ اپنی بقا اور مملکت کے تحفظ کے فطری حق کا استعمال تھا اور اکثر انصاف پسند مورخین اسے تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا شبلی الفاروق میں ان تمام ریشہ دوانیوں کو بیان کرنے کے بعد جو مدینہ کی تباہی کے لیے رومی اور غسانی حکمران کر رہے تھے، لکھتے ہیں :

> "غرض جب حضرت ابوبکرؓ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو عرب کی یہ حالت تھی کہ دونوں ہمسایہ سلطنتوں کا ہدف بن چکا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے شام پر لشکر کشی کی تو فوج کو مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ تم میں جو شخص مارا جائے گا شہید ہو گا اور جو بچ جائے گا مدافع عن الدین ہو گا یعنی دین کو اس نے دشمنوں کے حملے سے بچایا۔"

شہنشاہیت کا شرعی حدود سے تجاوز

ان تصریحات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خلافت راشدہ میں جس قدر جنگی کارروائی وہ درونِ ملک کی گئی وہ جہاد کے شرعی حدود کے اندر تھی اور اسے کسی طرح بھی ملک گیری کی ہوس یا بزورِ شمشیر

یہی شکل طلاق کی بھی ہے۔ یہ مکروہ و ناپسندیدہ سہی لیکن کسی وقت یہ ناگزیر بھی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات ضروری بھی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے وجود کو تسلیم کر کے اس کی قانونی حیثیت کو باقی رکھا گیا ہے۔ ہندو دھرم میں طلاق کا کوئی وجود نہیں۔ بس جو شادی ہو گئی وہ بہر حال عمر بھر باقی رہے گی۔ لیکن آخر وہ بھی طلاق کی ضرورت محسوس کرنے پر مجبور ہو گئے اور اب قانوناً اس کے جواز کو تسلیم کر لیا گیا۔

ایسی مکروہ اور ناپسندیدہ ـــــ مگر ناگزیر ـــــ چیز کے متعلق جو بہتر سے بہتر روش اختیار کی جا سکتی تھی وہ وہی ہے جو اسلام نے بتائی ہے۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ طلاق کوئی موثر حقیقت ہی نہیں بلکہ وہ اس کے وجود و اثر کو تسلیم کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اس نے اس کے امکانات کو کم سے کم بھی کر دیا ہے۔ اس نے طلاق پر ایسی قدغنیں بٹھا دی ہیں کہ اس کا عبور کرنا ہی سخت دشوار ہے۔ مثلاً :

۱- آنحضرتؐ کا یہ فرمان کہ "اللہ کے نزدیک مکروہ ترین چیز طلاق ہے" ایک مسلمان کو بلا وجہ طلاق دینے سے روکنے کے لیے کافی ہے۔

۲- اختلاف سے پہلے زن و شوہر کی طرف سے ایک ایک ثالث مل کر باہمی مصالحت کی کوشش کرنے کا بھی حکم ہے۔

۳- پھر طلاق کا احسن طریقہ یہ بتایا گیا ہے ایک بلا وطی طلاق دے کر چھوڑ دو یہاں تک کہ عدت گزر جائے۔

۴- اور اس دوران میں دونوں میاں بیوی ایک ہی گھر میں رہیں تاکہ جنسی کشش یا زیادتی کی ندامت دونوں کو پھر باہم مل جانے پر مجبور کر دے۔

۵- اس عرصے میں نان نفقہ شوہر کے ذمے ہو گا۔

۶- شوہر کو مہر بھی ادا کرنا ہو گا (اگر ادا نہ کر چکا ہو)۔

غرض اس قسم کی رکاوٹیں پیدا کر دی گئی ہیں تاکہ طلاق مشکل تر ہو جائے اور اس سے کم سے کم اور انتہائی مجبوری میں کام لیا جائے۔ مگر معاشرہ جب بگڑتا ہے تو اچھے قانون کی صورت بھی مسخ کر دی جاتی ہے۔ ہماری قوم میں یہ رواج پڑ گیا کہ ذرا غصہ آیا اور جھٹ تین طلاقیں دے کر گھر سے نکال دیا اور جو طریقہ طلاق دینے کا بتایا گیا ہے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ اور بعد میں پچھتانے

طلاق ناپسندیدہ فعل ہے

سنن ابو داؤد میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشا
طلاق کے بارے میں یوں مروی ہے:

البغض الحلال الی اللہ الطّلاق ۔ جائز باتوں میں جو شے اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ ہے طلاق ۔

اس حدیث سے سب سے پہلی بات جو ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ بعض چیزیں قانو
جائز ہوں لیکن وہ عند اللہ ناپسندیدہ بھی ہوتی ہیں اور اس کی واضح مثال طلاق ہے ۔ خدا اسے
پسند نہیں فرماتا کیونکہ زن و شوہر ایک نئے خاندان کا سنگ بنیاد ہوتے ہیں اور یہ معاشرے
کی خشتِ اوّل ہے ۔ اگر گھریلو زندگی ہی تلخ ہو کر رخنہ پیدا کر دے تو معاشرے پر اس کا ا
پڑنا لازمی ہے ۔ اس سے باہمی روابط اور میل جول میں فرق پڑ جاتا ہے اور امن کی زندگی منـ
سے بدل جاتی ہے ۔ خدا زن و شوہر کے جوڑے کو ایک نعمت بتاتا ہے (وخلقنکم ازواج
اور اس نعمت میں طلاق سے خلل پڑ جاتا ہے ۔ لہٰذا اس کے قابلِ نفرت ہونے میں بھی کلام نہیں
سوال یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ طلاق ناپسندیدہ شے ہے اسے جائز کیوں رکھ
اور اس کے وجود کو تسلیم کیوں کیا گیا ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی قابلِ نفرت چیزیں ایسی
ہوتی ہیں جو ناپسندیدہ ہونے کے باوجود کسی وقت ناگزیر بھی ہوتی ہیں ۔ گویا بعض اوقات
قدروں میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے اور اس وقت اہون البلیتین کے طور پر ایک کو قبول کرنا پڑتا
اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جنگ نہایت مکروہ اور ناپسندیدہ شے ہے لیکن کسی وقت اسے اخ
کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ اگر اس ناپسندیدہ شے کو قبول نہ کیا جائے تو اس سے بھی زیادہ ناپسند
فساد سامنے آئے گا ۔ یہی صورت تعزیرات و حدود کی بھی ہے ۔ یہ بھی کوئی پسندیدہ شے نہ
لیکن اسے اختیار اس لیے کرنا پڑتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو دوسرے شدید تر فتنے سر اٹھا